© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

حال ہی میں ایک غیر ملکی جریدے کے صفحۂ اول پر ایک بڑی رقّت آمیز تصویر دیکھنے میں آئی۔ ایک نحیف اور کمزور سا آدمی بڑی بے بسی کے عالم میں برف کے ایسے تودے پر اکیلا کھڑا ہے جو تیزی کے ساتھ پگھل رہا ہے۔ یہ تودہ ایک گہرے اور بھیانک سمندر کی تلاطم خیز موجوں کی زد میں ہونے کی وجہ سے شدت کے ساتھ زیر وزبر ہو رہا ہے۔ پوری فضا میں تاریکی کے اس قدر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں کہ انسان کی شکل وصورت پہچانی نہیں جاتی صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ تنہا ایک شخص یاس و نا امیدی کی تصویر بنا اپنے ہولناک انجام کی طرف ناگزیر طور پر بڑھتا جا رہا ہے۔ موجودہ انسان کی بے بسی اور بے کسی کی اس سے بہتر تصویر بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔

اس وقت پوری دنیا ظلمت کدہ بنی ہوئی ہے۔ مادیّت پرستی کے تاریک سائے ہر لمحہ بڑھتے جا رہے ہیں اور خدا کے عطا کردہ نورِ ہدایت کی اہمیت انسانیت کی نظروں سے بڑی تیزی کے ساتھ اوجھل ہو رہی ہے اور اسی وجہ سے وہ فکر و نظر کی تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے۔

جس طرح کوئی مصنوعی آفتاب پوری دنیا کو منور نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح انسانوں کا بنایا ہوا کوئی نظامِ زندگی کے سارے گوشوں کو بقعۂ نور نہیں بنا سکتا۔ انسان کی عقل بڑی محدود، اس کی بصیرت بڑی کمزور اور تجربہ بڑا ناقص ہے۔ اس لیے فکر و نظر کے جو مصنوعی آفتاب وہ کسی قوم کی معاشرتی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی فضا میں چھوڑیگا وہ ممکن ہے دنیا میں ایک ہنگامہ تو پیدا کر دیں مگر ان سے انسانی زندگی کبھی منور نہ ہو سکے گی۔ جہالت کی تاریکیوں کا انسان کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے آفتاب اور ماہتاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انہیں دُور کرنے کے لیے خالق کے بنائے ہوئے آفتابِ ہدایت کی ضرورت ہے۔

انسان کے بنائے ہوئے اصول اپنے اندر وہ ساری کمزوریاں رکھتے ہیں جو خود انسان کے اندر موجود ہیں۔ یہ امر انسان کے احاطۂ اختیار سے باہر ہے کہ وہ کائنات کے وسیع و عریض اور پُرپیچ نظام کو پُوری طرح سمجھے اور پھر یہ نظام جس طرح انسان پر مختلف زاویوں سے اثرانداز ہوتا ہے اس کا اچھی طرح ادراک کر سکے۔ پُوری کائنات کے بارے میں انسان کا علم کوئی یقینی اور قطعی علم نہیں۔ اس کی معلومات کا زیادہ تر حصّہ ظن و تخمین سے عبارت ہے پھر انسان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ مظاہرِ کائنات کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کے سمجھنے کا ہے۔ وہ کیمیاوی تجزیوں، سائنسی آلات، اور ریاضی کے اَدَق اور پُرپیچ کُلیوں کے ذریعے ان مظاہر کے متعلق کچھ اندازے تو لگا سکتا ہے، مگر ان کی اخلاقی اور روحانی قدر و قیمت کا کسی طرح تعیّن نہیں کر سکتا۔ مثلاً جنگلوں کے اشجار اور سبزے اور پہاڑوں کی چٹانوں اور سمندر کے پانیوں کے عناصرِ ترکیبی کی نوعیتیں تو معلوم کی جا سکتی ہیں مگر ان مظاہرِ قدرت کی عظمت اور خاموش گویائی انسان کے روحانی اور اخلاقی احساسات کے اندر جس طرح تحریک پیدا کرتی ہے وہ کسی سائنسی تجربے یا کسی کیمیاوی تجزیے یا کسی پیمائش کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ان احساسات کو نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ انسانی فطرت کا لازمی حصّہ ہیں۔ جو نظریۂ حیات انہیں نظرانداز کرے گا وہ انسانیت کے ایک نہایت لطیف، شیریں اور بڑے مؤثر عنصر سے صرفِ نظر کرنے کا ارتکاب کرے گا۔ اس لیے وہ خام اور ادھورا ہو گا۔

یہ تو ہے انسان کی کائنات کے خارجی اور محسوس مظاہر کو سمجھنے میں بے بسی۔ انسان کی اپنی دنیا بھی کسی طرح اس کائنات سے کم وسیع، گہری اور پیچیدہ نہیں۔ انسان ظاہر میں تو عناصر کا ایک حقیر اور کمزور سا پیکر ہے، مگر حقیقت میں وہ اس وسیع مادّی کائنات کے مقابلے میں اپنے اندر کہیں زیادہ وسعت اور گہرائی رکھتا ہے۔ اس کی ذہنی اور فکری رفعتوں کے سامنے ہفت افلاک کی بلندیاں ہیچ ہیں۔ اس کے جذبات و احساسات کی وسعتوں اور گہرائیوں کے سامنے سمندر کی گہرائیاں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ پھر جس طرح کائنات کے نہایت ہی مختصر سے گوشے انسان پر ظاہر ہیں اور ابھی اَن گنت گوشے پردہ راز میں ہیں، بالکل اسی طرح حیاتِ انسانی کا ایک نہایت ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محدود حصّہ انسان کی حدِادراک میں ہے اور باقی کثیر حصّہ ابھی اس کے لیے ناقابلِ فہم معمّا ہے۔ انسان کے متعلق اس تھوڑے سے علم کے ساتھ اس کی قسمت کے فیصلے کرنے کی جسارت بالکل ایک بے جا جسارت ہے۔ اور اسی جسارت نے اس کی زندگی کو ایک حسرتناک المیہ بنا دیا ہے۔

انسان کو اپنی اس بے بسی کا احساس قدم قدم پہ ہوتا ہے، مگر مادّیت پرستی نے اس کی عقل اور اس کے وجدان کو مادّیت کے خم و پیچ میں اس قدر اُلجھا دیا ہے کہ وہ اس خارزار سے نکل کر صراطِ مستقیم پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ اس کی فطرت اسے پکار پکار کر کہتی ہے کہ وہ خالق و مالک کا ایک ناچیز بندہ ہے اور اس کے لیے فلاح و کامرانی کا یہی ایک معقول راستہ ہے کہ اس کے دیئے ہوئے نظامِ زندگی کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے، مگر مادیت پرستی کا جنون اسے فرعون بنا کر اُس کے اندر یہ زعم باطل پیدا کرتا ہے کہ وہ خود اپنا خدا ہے اور اُس سے بڑی کوئی ذات نہیں جو حق و صداقت کے راستے پر اس کی رہنمائی کرے۔ وہ اپنے معاملات کا خود مالک، اپنی زندگی کے ضابطے کا خود مرتّب، اور اپنے افعال و اعمال کا خود مختار ہے۔ اُس سے بڑھ کر کوئی ایسی ارفع و اعلیٰ ذات نہیں جس کے ہاتھ میں اس کے معاملات ہوں، جس کے عطا کردہ ضابطے اس کے لیے واجب الاحترام ہوں اور جس کے سامنے وہ اپنے افعال و اعمال کے لیے جوابدہ ہو۔

انسان کی داخلی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ خدا کے خلاف بغاوت کے باوجود اپنے لیے کوئی نہ کوئی خدا بنانے پر اپنے آپ کو ہر لمحہ مجبور پاتا ہے۔ اگر اس نے سچے خدا کی غلامی کو چھوڑ دیا ہے تو لاتعداد جھوٹے خداؤں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا ہے اور ان کے ساتھ وہ عبودیت کا وہی رشتہ اُستوار کیے ہوئے ہے جو ایک خدا پرست، خالقِ کائنات کے ساتھ اُستوار کرتا ہے۔ خدا پر ایمان، اُس کے ساتھ گہری محبت و عقیدت، محض اُس کی خوشنودی کے حصول کے لیے جد و جہد، اور اپنی زندگی کو اس کی خواہش کے مطابق ڈھالنے کا مقدس جذبہ یہ سب حاسّہ مذہبی کے مختلف مظاہر ہیں اور اس حقیقت کے لیے ناقابلِ تردید شہادت فراہم کرتے ہیں کہ کسی بلند و برتر ذات پر ایمان اور اسی کی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آرزو اور کوشش انسان کے ایسے فطری داعیات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں جو مذہبی احساس کے چشمے سے پھوٹتے ہیں۔

جدید انسان نے علانیہ خدا کے وجود کا انکار کیا، ایمان باللہ جیسے فطری داعیہ کی نفی کی، مذہب کی غیر معمولی اہمیت کی تکذیب کی اور بڑے طنطنہ کے ساتھ یہ کہا کہ کسی مابعد الطبیعت ہستی کا وجود محض واہمہ ہے اس لیے اس پر ایمان فریبِ نفس ہے۔ مذہب پرستی جاہلوں اور بیکار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ اس کا پرچار کر کے انسانیت کے ساتھ ایک بہت بڑا دھوکا کیا گیا ہے۔ جدید انسان نے یہ بات بڑی توجہ کے ساتھ سُنی اور مذہب کو خیر باد کہہ دیا۔ مگر اس کا حاسۂ مذہبی اپنی جگہ پر جُوں کا توں قائم رہا اور اس نے اِن "حکماء" کی بارگاہ میں گذارش کی کہ خدائے حقیقی کو تو اس نے اپنے دل و دماغ سے نکال دیا ہے مگر اس کے جانے سے اس کی زندگی میں جو روحانی اور اخلاقی خلا پیدا ہوا ہے اُسے پُر کرنے کا کوئی انتظام ہونا چاہیے کیونکہ وہ اس روحانی خلا کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسانیت کے اِن نادان دوستوں نے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے انہیں قومیت کے بُت، وطنیت کے بُت پرستش کے لیے عطا کیے اور خدا پرستی کی جگہ انہیں مفاد پرستی کا مسلک سکھایا۔ جدید انسان اِن نئے خداؤں کو پا کر ذہنی طور پر بڑا خوش ہوا کہ چلیے ایک اَن دیکھے خدا کی جگہ کئی ایک معبودانِ محسوس ہاتھ لگ گئے ہیں جن کی غلامی اختیار کر کے وہ دنیا میں دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ آسودہ حال اور اقبال مند ہو سکتا ہے۔ اس کے نئے خداؤں کو صرف اُس کی اور اُس کی قوم اور اس کے ہم وطنوں کی خوشحالی مطلوب ہو گی اور وہ سارے انسانوں کے رازق بننے کے بجائے صرف اپنی قوم کو فیضانِ ربوبیت سے بہرہ مند کریں گے۔

جدید انسان نے اپنے حاسۂ مذہبی کی تسکین کے لیے اِن نئے تراشیدہ خداؤں کی طرف رجوع کیا۔ قوم کو اپنی مقدس آرزوؤں اور تمناؤں کا واحد مرکز بنایا۔ خاکِ وطن کے ساتھ عقیدت و محبت کا نہایت ہی گہرا رشتہ استوار کیا اور جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک اور قوم کی زمامِ کار تھی، ان کے احکام اور اُن کے بنائے ہوئے ضابطوں کی اسی خوشدلی کے ساتھ پابندی کی جس خوشدلی اور احترام کے ساتھ منشائے خداوندی کی تکمیل کی جاتی ہے۔ مگر جھوٹے خداؤں کی خدائی قبول کرنے سے انسانیت کا جو عبرتناک انجام ہوا ہے وہ سب کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سامنے ہے پوری انسانیت چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اس طرح بٹ گئی کہ ان کے درمیان اخوت کا کوئی رشتہ باقی نہ رہا۔ چونکہ ہر قوم نے اپنی قومیت کو خدا بنا لیا تھا اس لیے قومی اور ملکی حدود سے باہر نکل کر اس کے لیے سوچنا کسی طرح بھی ممکن نہ رہا۔ انسانیت کے مختلف طبقات کے درمیان ہمدردی، محبت اور تعاون کے جذبات بالکل ختم ہو گئے۔ ہر قوم نے یہ سمجھا کہ دنیا میں جینے کا حق صرف اسے حاصل ہے اور دوسری قومیں اس کرۂ ارض پر بار ہیں جنہیں جتنی جلدی مٹا دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ ہر قوم نے دوسری اقوام کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنا اپنا بنیادی حق سمجھا اور اس مقصد کے لیے ان پر ناجائز تسلط قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح دنیا میں جارح اور استعمار پسند قوموں نے کمزور ممالک کو بری طرح تاخت و تاراج کیا۔ ان کے باشندوں کو غلام بنایا اور ان کے وسائل کو دل کھول کر لوٹا۔

انسانیت نے یہ غیر انسانی طرزِ عمل اختیار کر کے نہ صرف اولادِ آدم کو متعدد متحارب گروہوں میں بانٹ دیا بلکہ انسان کو اپنی قوم اور اپنے وطن کے اندر اور خود اپنے آپ سے بیگانہ بنا کر رکھ دیا۔ خدا کے عطا کردہ ضابطوں سے منہ موڑنے کے بعد انسان کے ذہن میں قدرتی طور پر کسی دوسرے ضابطۂ حیات کی تلاش پیدا ہوئی اور اس ضمن میں سب سے پہلے مسئلہ یہ سامنے آیا کہ اگر اس ضابطے کی اساس خدا کی رضا جوئی نہیں تو پھر اور کیا ہونی چاہیے۔ اس کے جواب میں عجیب و غریب فلسفے گھڑے گئے۔ کبھی یہ کہا گیا اس ضابطۂ حیات کی اساس محض فرض کی ادائیگی کا جذبہ ہونا چاہیے۔ کبھی خدمت برائے خدمت کا نظریہ پیش کیا گیا۔ بالآخر بات اس بات پر جا کر ٹوٹی کہ جس کو تم معبود مانتے ہو اسی کی خوشنودی درحقیقت تمہارے ضابطۂ حیات کی اصل اساس ہونی چاہیے۔ چنانچہ ملک اور قوم کی بہتری اور فلاحِ انسانی فکر و عمل کا واحد محرک قرار پائی۔ پھر اسی کے ساتھ یہ سوال درپیش ہوا کہ کسی قوم یا ملک کی فلاح کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے فلاح کی نوعیت کا اچھی طرح تعین ہونا چاہیے۔ مذہب سے انحراف کے بعد چونکہ ان لوگوں کے پاس ضابطۂ حیات کی تشکیل کے لیے کوئی روحانی اور اخلاقی بنیاد باقی نہ رہی تھی اس لیے بہت سی علمی موشگافیوں کے بعد وہی فیصلہ ہوا جو خدا سے بے نیاز ہونے کے بعد ممکن ہو سکتا ہے یعنی مادی فلاح و بہبود کو کسی قوم اور ملک کی کامرانی کا معیار قرار دیا جائے۔ اس مقصد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے حصول کے لیے اور لوگوں کو ایک سخت قسم کے ڈسپلن کا پابند بنانے کے لیے نظامِ تعلیم و تربیت میں تبدیلی کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کا ہر فرد اسی ایک مقصد کے حصول کی خاطر تمام دوسرے احساسات سے بے پروا ہو کر سرگرمِ عمل ہُوا اور اس نے اپنی قوم کو دولت و ثروت کے اعتبار سے مالا مال کرنے کی کوشش کی اور اس کام کو اسی اخلاص کے ساتھ سرانجام دیا جس مخلصانہ جذبہ کے ساتھ کوئی خدا پرست اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ دنیا کے ہر ملک میں سرمایہ داری کے دیوِ اسفند یاد نے اپنے پنجے گاڑنے شروع کیے اور غریب اور کمزور طبقوں پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا۔ مغربی اقوام نے وطنیت، قومیت اور زر پرستی کے زیرِ اثر آکر مذہبی تثلیث کی جگہ ایک نئی تثلیث قائم کی جو وطن پرستی، قوم پرستی اور زر پرستی سے عبارت تھی۔ وطن اور قوم کی محبت کا مقصد تو محض قوم کی شیرازہ بندی تھا تاکہ اس کے اجزاء روحانی اخوت کے ختم ہو جانے کے بعد منتشر نہ ہونے پائیں۔ مگر عمل کا سب سے بڑا محرک دولت کا حصول ہی ٹھیرا اور اس طرح پوری دنیا جہنم بن گئی۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں جو خوفناک تباہی ہوئی اس میں اس نئی تثلیث کی پرستش محرک کے طور پر کارفرما تھی۔

ملک کے اندر بھی اس دولت پرستی نے ہر لحاظ سے معاشرے کے اندر بگاڑ پیدا کیا۔ انسانوں کے مابین جذبۂ تعاون کے بجائے بڑا غیر صحت مندانہ جذبۂ مسابقت پیدا ہُوا اور محض حماقت سے یہ فرض کر لیا گیا کہ زندگی کے سارے مسائل آزاد مسابقت سے طے کیے جا سکتے ہیں۔ مسابقت کا اصول تو اس صورت میں کسی حد تک صحیح ثابت ہو سکتا ہے جب معاشرے کا ہر فرد دوسرے کے مساوی ہو۔ لیکن جو معاشرہ مختلف قسم کے کمزور اور قوی لوگوں پر مشتمل ہو اس میں مسابقت کی عملداری کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ کمزوروں، بے بسوں اور زیردستوں کو بالادستوں اور طاقتوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جس طرح چاہیں ان بے چاروں کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنائیں اور کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہ ہو۔ سرمایہ داری کے عفریت نے غریبوں کا آخری قطرۂ خون تک نچوڑ لیا اور وہ بے چارے برابر اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ وہ ملک و قوم کی سربلندی کے لیے جاں نثاری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ زرداروں نے ان کے بچوں اور ان کی عورتوں کو کارخانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں جوت لیا مگر انھوں نے خاندانی نظام کی اس تباہی کو قومی فلاح و بہبود کے نام پر بڑے صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ ان ظالموں نے ان کے عقائد اور عبادات تک کے نظام کو اپنی مرضی کے مطابق تہ و بالا کیا مگر وہ صرف اس وجہ سے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے کہ اس سے قوم اور وطن کو فائدہ پہنچے گا۔ قومیت اور وطنیت کے نعرے تو محض دھوکا تھے جن کے پیچھے سرمایہ دار بڑے اطمینان کے ساتھ جونک کی طرح غریبوں کا خون چوستا رہا۔ دولت کے انبار ہاتھ لگنے کی وجہ سے اقتدار بھی اب اُس کے تابع تھا۔

مغربی نظام کے قیام سے پیشتر جب دنیا میں بادشاہت قائم تھی اس وقت سرمایہ دار زبردست آزادی میں اس قدر مطلق العنان نہ تھا جتنا کہ وہ جمہوریت کی ترقی کے بعد ہو گیا۔ پہلے اس کے پاس صرف دولت تھی اور اس کی مدد سے وہ چند افراد کو ستا سکتا تھا۔ مگر اس سے اوپر بادشاہ کی ذات اس کے ناپاک عزائم میں حائل ہوتی اور وہ کمزوروں پر اپنا دستِ ظلم دراز کرنے میں اتنا بیباک اور جری نہ ہوتا جتنا کہ وہ جمہوریت کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہو گیا۔ مال و دولت نے اُسے اقتدار میں دخیل کیا اور اس طرح اس کے لیے فوج، پولیس اور انتظامیہ کی قوت بھی فراہم کر دی۔ ہوسِ زر کے اس غلام نے عنانِ اقتدار حاصل کر لینے کے بعد انسانیت کی ایسی مٹی پلید کی کہ اس کے تصور سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ مگر اس کی ہنرمندی دیکھیے کہ انسان اپنی اس ذلت و خواری کے باوجود اس طلسم سے نکلنے نہیں پاتا کہ وہ فلاح و کامرانی حاصل کر رہا ہے۔ سرمایہ پرست کے صاحبِ اختیار ہونے کی وجہ سے ذی روح انسان کے مقابلے میں بے جان سکے کی اہمیت بڑھی اور انسان کو بطورِ ایندھن سکے ڈھالنے والی بھٹیوں میں جھونک دیا گیا۔ غریبوں کے لختِ جگر یا اُس کی بے حس مشینوں کے غلام بنے یا وہ اس کی جنگِ زرگری میں کام آتے۔ دولت کی محبت میں اندھا ہونے کی وجہ سے سرمایہ دار تو عفت، پاکدامنی، شرافت اور مروت کے احساسات سے محروم ہی تھا، مگر اس نے بڑی چالاکی اور عیاری سے عوام کو بھی ان انسانی صفات سے محروم کر دیا۔ اُن کے اخلاق کو خراب کیا تاکہ ان کے اندر نیک و پاک کوئی جوہر باقی نہ رہے اور وہ اندھے بہرے بن کر صرف اس کی چاکری کرتے رہیں۔ ان کے ذوق کو بگاڑا کیونکہ عوام کا ذوق بگڑنے سے معاشرے میں ایسی روحانی تاریکی چھا جاتی ہے جس میں مال و دولت کے حریص عوام کی جیبوں پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آرٹ، فیشن، تفریح، رقص و سرود کے رنگا رنگ پروگرام ترتیب دے کر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ مگر داد دیجیے ان سرمایہ داروں کی چابکدستی کو کہ عوام اُن کی اِن اخلاق سوز کارروائیوں کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں اور انہیں آرٹ اور ثقافت کے علمبردار سمجھتے ہوئے ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ موجودہ دور کی مادّی تہذیب کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس نے مہذّب ڈاکوؤں، چوروں، زبردست آزاروں اور عوام کی عزت و آبرو سے کھیلنے والوں کو نہ صرف تختِ اقتدار پر متمکّن کیا ہے بلکہ انہیں معاشرے میں بھی عزت و احترام کا ایک بلند مقام عطا کیا ہے۔

تمدن کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے عوام صرف ایک چیز کا احساس ہی کر سکتے تھے اور وہ بھوک یا مادّی زندگی کی ضروریات سے محرومی کا احساس تھا۔ اس احساس کو ختم کرنے کے لیے ایک غلط نظریے کا پرچار کر کے بھوک اور افلاس کی ساری ذمہ داری خود انسان اور فطرت پر ڈال دی گئی۔ فطرت کے بارے میں عوام کو یہ تاثر دیا گیا کہ یہ بڑی بے رحم، حریص اور بخیل ہے اور انسانوں کی تباہی و بربادی میں لذت محسوس کرتی ہے۔ اس ظالم نے انسانی آبادی اور وسائل رزق میں کوئی توازن برقرار نہیں رکھا۔ یہ اولادِ آدم کی تعداد میں تو بے تحاشا اضافہ کرتی چلی جاتی ہے مگر اس کے جن خزانوں سے ان انسانوں کو وسائلِ زندگی مہیا ہوتے ہیں اُن کے منہ کھولنے پر تیار نہیں ہوتی اور اس طرح آدم کے بیٹوں کو فاقہ مست اور زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم رکھ کر ان کے کرب و اضطراب کا تماشا دیکھتی ہے۔ اس لیے کسی معاشرے میں اگر غربت اور افلاس ہے تو اس کی وجہ یا تو فطرت کی کوتاہ دستی اور بے حسی ہے یا انسان کی اپنی عاقبت نا اندیشی کہ وہ انسانیت کے اس خطرناک انجام کو جانتے ہوئے بھی انسانوں کی تعداد میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے تاکہ فطرت انہیں بربادی کے عمیق غاروں کی طرف دھکیل دے۔

دورِ جدید کا بے بس انسان اس نظریہ پر ایمان لے آیا اور خود اپنے ہاتھ سے اپنی نسل کا گلا گھونٹنے لگا۔ اس کے دل و دماغ کو ان سرمایہ داروں نے اس طرح مفلوج کر رکھا تھا کہ اس نے خود اپنی ذات اور اپنی اولاد کو اپنا دشمن سمجھنا شروع کیا۔ اس کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہ ہوا کہ اُس ظالم کی چیرہ دستیوں کو سمجھے جو اُس کی محرومیوں کا اصل باعث ہے۔ اسے لے دے کر یہی ایک بات معقول دکھائی دیتی تھی کہ وہ افزائشِ نسل کے جرم کا مرتکب ہے۔ اس میدان میں بھی سرمایہ دار کو ہر لحاظ سے غیر معمولی کامیابی نصیب ہوتی۔ تحدیدِ نسل کی تحریک کے زور پکڑتے ہی ایسے آلات اور ادویہ کی شدید مانگ پیدا ہوئی جن کی مدد سے افزائشِ نسل کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رد کا جا سکے۔ سرمایہ دار نے اس موقع سے ان اشیاء کو وسیع پیمانے پر تیار کروا کر ان سے منڈیاں بھر دیں اور اس طرح ان کی فروخت سے دولت کی بہت بڑی مقدار حاصل کی۔

جس رفتار سے تحدید نسل کی تحریک زور پکڑتی گئی اسی رفتار سے یورپ میں جنسی انارکی کا طوفان اٹھا۔ حرام اولاد کی پیدائش اور اس طرح معاشرے میں بدنامی کا خوف آزاد شہوت رانی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مانع حمل آلات اور ادویہ کی موجودگی اور ان کے استعمال کی باقاعدہ تربیت سے نوجوانوں کے اندر اخلاقی بے راہ روی کا طوفان اُمڈ آیا۔ مذہبی اقدار کی گرفت ڈھیلی ہونے کی وجہ سے وہ مادی مفادات اور حسی لذات کے غلام تو پہلے ہی بن چکے تھے، تحدید نسل کی اس تحریک نے عیش پرستی کے عملی راستہ کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر نوجوان خاندانی ذمہ داریوں سے بے نیاز رہ کر صنفی جذبات کی تسکین کے لیے نئی نئی راہیں نکالنے لگا۔ اس طرح ایک طرف تو اخلاق کا جنازہ نکلا اور دوسری طرف خاندانی نظام کا شیرازہ منتشر ہوا۔

اس صورتِ حال سے بھی سرمایہ دار نے فائدہ اٹھایا۔ انسان چونکہ خاندانی ذمہ داریوں سے کافی حد تک آزاد ہو چکا تھا اس لیے وہ محض کمانے والا حیوان بن گیا۔ عورتیں گھریلو ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر کارخانوں اور دفاتر میں کام کرنے لگیں۔ مشینوں کے ہر آن بڑھتے ہوئے استعمال کی وجہ سے مزدور کا مقام پہلے ہی کافی گر چکا تھا اور اس کی حیثیت کافی حد تک کمزور ہو چکی تھی۔ ان حالات میں جب عورتیں بھی کارخانوں اور دوسرے صنعتی اور تجارتی اداروں میں کام کرنے پر آمادہ ہو گئیں تو محنت کی اور بھی بے وقعتی اور تذلیل ہوئی اور سرمایہ دار نے اپنی مرضی کے مطابق اس سے سودا بازی کی۔ اس لیے تو طبقے کو ایک مدت تک اس بات کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ سرمایہ دار کے ظلم و ستم کے خلاف زبان کھول سکے یا منظم ہو کر اپنا حق مانگ سکے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا اگر دقتِ نظر سے مطالعہ کریں تو آپ کو ایک بات خاص طور پر یہ نظر آئے گی کہ سرمایہ دار کسی مرحلہ پر بھی یہ نہیں چاہتا کہ انسان کی انسانیت بیدار ہو۔ اسے اس بات کا علم ہے کہ اس جدید مادی تہذیب میں اگر کبھی انسان کو شکایت ہوگی تو بھوک کی شکایت ہوگی اور وہ اگر کبھی گلہ کرے گا تو اس بات کا کرے گا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ اس سے کام تو بہت زیادہ لیا جاتا ہے مگر اس کے مقابلے میں اسے چارہ کم دیا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا آرزومند نظر آتے گا کہ اسے بھی عیاشیوں کے لیے سرمایہ داروں کی طرح مواقع فراہم ہوں۔ اس کا ذہن کبھی اس چیز کی طرف منتقل نہ ہو گا کہ اس نظام نے اس سے کس طرح متاعِ اخلاق چھین لی ہے، اس نے اسے کس انداز کا حیوان بنا دیا ہے، اس نے اسے پاکیزہ اور لطیف احساسات سے کہاں تک محروم کیا ہے، اس کے خاندانی نظام کو درہم برہم کرکے گھریلو سکون اور آرام سے اسے کس حد تک تہی دست بنا دیا ہے۔

ہمارے نزدیک سرمایہ داری کی یہی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ اس نے انسان کے اندر اتنا فہم اور احساس ہی نہیں رہنے دیا کہ وہ پیٹ اور جیب سے بلند ہو کر کسی دوسرے مسئلے پر غور کرے۔ باقی جہاں تک افلاس اور غربت کے احساسات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شکایتوں کا تعلق ہے ان سے سرمایہ دار بڑی آسانی کے ساتھ نمٹ سکتا ہے۔ جب بھی اس قسم کے احساس کی کوئی لہر اُبھرتی ہے تو وہ بڑی آسانی سے اس کا رُخ ایسی سمت موڑ دیتا ہے جس سے مفلوک الحال عوام خود اس کی زد میں آ جاتے ہیں اور وہ اپنی اس مصیبت کے لیے اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب غیر متوازن صنعتی ترقی کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے لگی اور عوام بنیادی ضروریات سے بھی محروم رہنے لگے اور ان کے اندر اس محرومی کا احساس بیدار ہوا تو سرمایہ دار نے جھٹ سے اس کے سامنے مالتھس کا نظریۂ آبادی پیش کر دیا جس میں عوام کی غربت اور افلاس کی ساری ذمہ داری خود اُن پر آن پڑتی ہے۔

اسی عیاری سے سرمایہ دار موجودہ اضطراب کا مقابلہ کر رہا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم سے کچھ مدت پیشتر عوام کے اندر یہ احساس انگڑائیاں لے رہا تھا کہ انسان انسانیت کے جوہر سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور محض کارخانے کی ایک بے حس مشین بن گیا ہے۔ پھر جنگ کے دوران انسان کی ناقابلِ بیان تباہی نے بھی اُس کے سوئے ہوئے ضمیر کو کسی حد تک بیدار کیا اور انسان یہ سوچنے لگا کہ وہ حیوان تو نہیں کہ اسے دنیا میں صرف چارہ درکار ہے اور زندگی کی کسی اعلیٰ و ارفع قدر کی اُسے سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں۔ پھر اُسے اس امر کا بھی احساس ہوا کہ اس کی مقدس زندگی کن گھٹیا مقاصد کی خاطر ضائع کی جا رہی ہے۔ ڈالر، پاؤنڈ، مارکس، فرانک روبل اور لیرا جیسے بے جان اور حقیر سکّوں کی بالادستی قائم کرنے کے لیے اس کے خون سے ہاتھ رنگے جا رہے ہیں۔ ان مختلف احساسات کی لہریں انسان کے قلب و دماغ میں آہستہ آہستہ ارتعاش پیدا کر کے اس کی سوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئی انسانیت کو جگا رہی تھیں اور اس بات کی توقع تھی کہ انسان اپنی بربادی کی اصل وجہ یعنی انسان پر انسان کی خدائی کو جان کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اسی تگ و دو میں اُن اقدار کا متلاشی ہوگا جو اُسے دورِ حاضر کے فراعنہ اور نماردہ سے نجات دلا کر اُسے عدل و انصاف کی بنیاد پر استوار کریں اور اس کی روح کے لیے آرام اور سکون کا سامان فراہم کریں۔ مگر داد دیجیے ان جھوٹے خداؤں کی ہوشیاری کی کہ انہوں نے عوام کو اپنے تسلط سے نکلنے نہ دیا بلکہ ان کے ذہنوں کو اس غلط راہ پر لگا دیا کہ فساد کی اصل جڑ انسان پر انسان کی خدائی نہیں بلکہ ذاتی ملکیت کا وجود ہے، اس لیے اُن کی فلاح و کامرانی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ تمام ذرائع پیداوار کی ملکیت افراد سے چھین کر چند کامریڈوں کی تحویل میں دے دی جاتے۔ پہلے تو محنت کش عوام اپنی محنت ظالم سرمایہ داروں کے ہاتھ بڑی بے بسی کے عالم میں فروخت کر کے اس کے ساتھ اپنی آزادی، عزتِ نفس اور خودداری کو ان کے پاس رہن رکھنے پر مجبور ہوتے تھے۔ مگر اس نئے طلسم میں گرفتار ہو کر اب انہوں نے مال و متاع کی وہ حقیر سی پونجی جو ان کے پاس تھی، اسے بھی چند جھوٹے خداؤں کے قدموں میں لا ڈالا ہے، اور ان چالاک اور عیار لوگوں کے پراپیگنڈے کا کمال دیکھیے کہ انہوں نے غریبوں کو اب اس فریب میں مبتلا کر دیا ہے کہ ان کی محرومیوں کا واحد سبب یہی ہے کہ انھوں نے ان جھوٹے خداؤں کو اپنی جان اور مال کا پوری طرح مالک کیوں نہیں بنا دیا۔

مذہبی کتب میں خداوند قدوس انسان سے حقِ عبودیت کی ادائیگی کے لیے جو جان و مال کی قربانی کا تقاضا کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کے ایثار سے انسان صحیح معنوں میں خداوند تعالیٰ کا مطیع و فرماں بردار بندہ بنتا ہے اور اپنے عمل سے اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے خالق اور مالک کی غیر مشروط اطاعت اور بندگی کے لیے بالکل آمادہ ہے اور اس راہ میں وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ سرمایہ داری میں انسان پر انسان کی خدائی کا ایک جزو تو مکمل ہو گیا تھا مگر دوسرا جزو نامکمل تھا۔ اشتراکیت نے اس کی تکمیل کر کے صحیح معنوں میں انسان پر انسان کی خدائی مسلط کر دی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ پراپیگنڈے کی حد تک تو معاشرے کی خدائی کا اعلان کیا جاتا ہے اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تم کسی فرد کے نہیں بلکہ معاشرے کے غلام ہو اور اس کی غیر مشروط اطاعت تمہاری زندگی کا اصل

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

© rasailojaraid.com